

اقبال اور سیکولرزم

بشیر احمد ڈار

لفظ 'سیکولر' اپنے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں یورپ کے مذہبی ماحول کی پیداوار ہے۔ عیسائی مذہب کی جو تشریح اور تعبیر پولوس نے کی، اس میں چند اخلاقی اصول تو موجود تھے، لیکن شریعت کی اس میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس زمانے کے مروجہ باطنی مذاہب اور اسرار میں یہ تصور موجود تھا کہ انسانی روح ایک پاکیزہ شے ہے، جو بد قسمتی سے اس مادی دنیا کی قید میں اسیر ہو گئی ہے۔ اس لیے انسان کا نصب العین یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے، اس دنیاوی زندگی کی آلائش سے اپنے آپ کو پاک رکھا جائے۔ انہی تصورات کے زیر اثر پولوس نے حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو اس طرح پیش کیا کہ گویا وہ بھی اسی مقصد کی خاطر اس دنیا میں آئے تھے۔ چنانچہ پہلی دو تین صدیوں تک عیسائیوں کی کثیر تعداد اپنی انفرادی نجات کی کوششوں میں منہمک رہی۔ معاشرتی اور تمدنی ذمہ داریاں ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ عیسائیت ایک نظامِ رہبانیت تھا، جو اس ناپاک دنیا میں قائم کیا گیا اور جس کا مدنی امور میں کوئی دخل نہیں تھا۔ چنانچہ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے، وہ ہر معاملے میں رومی حکومت کے زیر فرمان رہی۔ قسطنطین نے بادشاہ بننے کے بعد عیسائیت قبول کر لی۔ اس نے کوشش کی کہ اس نئے مذہب کی بنیاد پر رومی سلطنت میں اتحاد و یگانگت پیدا کر سکے لیکن حقیقت میں عیسائیت بطور نظامِ اجتماع نہ اُس وقت کارآمد تھی اور نہ اس وقت کارآمد ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطین کے جانشین جولین نے پھر سے دیوتا پرستی کی طرف رجوع کیا اور اس کی فلسفیانہ تاویلات سے لوگوں میں وحدتِ افکار و کردار پیدا کرنے کی کوشش کی۔

انہی قدیم باطنی اسرار اور عیسائیت کے تصورات کی آمیزش سے مانی نے اپنا فلسفہ حیات

پیش کیا۔ اس کی نمایاں خصوصیت جسم و روح، مادیت و روحانیت، یزدان و اہرمن کی مطلق مٹھویت ہے جن میں کسی قسم کا نقطہ اتصال موجود نہیں۔ اس مانوی تحریک نے عیسائیت کے ارتقا پر بڑا اثر ڈالا۔ اگسٹائن جس نے کلیسا کی ابتدائی تاریخ میں ایک مؤثر کردار ادا کیا ہے، عیسائیت قبول کرنے سے پہلے مانوی مذہب ہی کا پیرو تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ نور و ظلمت کی مانوی مٹھویت کے افکار اس کے باعث عیسائیت میں رائج ہوئے۔ جیسا کہ اقبال نے خود ایک جگہ کہا ہے کہ ”مغرب نے مادے اور روح کی مٹھویت کا عقیدہ مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد مٹھویت کا قائل نہیں۔ اسلام کی رُو سے خدا اور کائنات، روح اور مادہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ، روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔

خطبات میں فرماتے ہیں کہ ”اسلام نے روحانی اور مادے کی تفریق کبھی روا نہیں رکھی۔ کسی عمل کی ماہیت کا فیصلہ اس لحاظ سے نہیں کیا جاتا کہ اس کا تعلق کسی حد تک حیات دنیوی یا سیکولر سے ہے، بلکہ اس کا انحصار صاحب عمل کے ذہنی رجحان پر ہے۔ اگر زندگی کی مقصدیت کو سامنے نہیں رکھا جاتا تو ہمارا عمل دنیوی ہے، اور اگر یہ مقصدیت ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں تو ہمارا عمل روحانی ہے۔ قرآن پاک کے نزدیک حقیقت مطلقہ محض روح ہے اور اس کی زندگی عبارت ہے اُس فعالیت سے جس کو ہم زمانے میں جلوہ گرد دیکھتے ہیں۔ لہذا یہ طبعی اور مادی اور دنیوی ہی تو ہے جس میں روح کو اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے اور اس لیے ہر وہ شے جسے اصطلاحاً سیکولر کہا جاتا ہے اپنی اصل میں روحانی تسلیم کی جائے گی۔“ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۳۷-۲۳۹)

تن و جاں را دوتا گفتن کلام است تن و جاں را دوتا دیدن حرام است
 بہ جاں پوشیدہ رمز کائنات است بدن حالے ز احوال حیات است
 (تن و جاں کو الگ الگ کہا تو جاسکتا ہے، مگر انھیں الگ الگ سمجھنا حرام ہے۔ جان کے اندر کائنات کا راز پوشیدہ ہے، بدن احوال حیات میں سے ایک حال ہے)۔

زندگی کے اس غلط نقطہ نظر کے باعث عیسائی مذہب میں شروع ہی سے کلیسا اور ریاست

کے درمیان ایک قسم کا بُعد اور تفریق پیدا ہوگئی۔ یہ صحیح ہے کہ کلیسائی اقتدار اور حاکمیت نے کافی عرصے تک یورپ کے مختلف ملکوں میں خالص دینی بنیاد پر اتحاد و یگانگت قائم رکھی لیکن لوہتر کی بغاوت سے یہ حالات یکسر بدل گئے۔ ہزار برائیوں کے باوجود کلیسائی اقتدار نے مذہبی اور اخلاقی اقتدار کو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نصب العین بنایا ہوا تھا۔ لوگ زندگی کے ہر پہلو کو مذہبی اور اخلاقی نقطہ نگاہ کے مطابق ڈھالتے تھے۔ ان کی معاشرتی طرز زندگی، ان کا اقتصادی اور معاشی نظام، سلطنتوں کے باہمی میل جول سبھی اخلاقی اصولوں کی روشنی میں طے پاتے تھے۔ لیکن لوہتر نے جب کلیسا کے خلاف آواز اٹھائی تو اس سے بہت سے دیگر نتائج کے علاوہ دو باتیں خاص طور پر ظاہر ہوئیں۔ پروٹسٹنٹ راہنماؤں نے مروجہ مذہبی رسوم پر بڑی سخت تنقید کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ کلیسا کی حاکمیت کے زیر اثر افراد کی آزادی اور اختیار ختم ہو چکا ہے۔ وہ مذہبی اور اخلاقی معاملات کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔ آخری فیصلہ ہر معاملے میں کلیسا کا ہوتا ہے۔ اس کے خلاف ان راہنماؤں کا موقف یہ تھا کہ اخلاق کا آخری معیار ہر انسان کا اپنا دل اور ضمیر ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کی سماجی اہمیت ختم ہوگئی۔ ہر آدمی کو اجازت تھی کہ وہ اپنی داخلی زندگی میں مذہب سے وابستگی قائم رکھتے ہوئے زندگی کے دوسرے شعبوں میں جس طرح چاہے عمل کرے۔ مذہب محض ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق اس کی باقی ماندہ زندگی سے کچھ نہیں اور نہ ہونا چاہیے۔ اس اصول کے تحت مذہب اور ریاست میں مکمل علیحدگی اور تفریق پیدا ہوگئی۔ یہ تفریق ایک معنی میں اسی فلسفیانہ عمودیت کا منطقی نتیجہ تھی جو مشرعی حکمانے بقول اقبال مانی کے زیر اثر اختیار کی تھی:

بدن را تا فرنگ از جاں جدا دید نگاہش ملک و دیں را ہم دوتا دید
 کلیسا سیم پطرس شمارد کہ او با حاکمی کارے ندارد
 بہ کارِ حاکمی مکر و فتنے ہیں تن بے جان و جان بے تنے ہیں
 (جب فرنگ نے بدن کو روح سے الگ دیکھا تو پھر اس نے حکومت اور مذہب کو بھی جدا جدا کر دیا۔
 کلیسا صرف پطرس کی تسبیح شمار کرتا رہا، اسے حکومت سے کوئی سروکار نہ رہا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں حکومت مکروفرن پر مبنی ہے، تن بے جان ہو گیا، اور جان بے تن)۔

ملک و دین — ریاست اور مذہب، مملکت اور اخلاق کی اس جدائی کا علم بردار میکیاولی

تھا جس نے اپنی کتاب پرنس (شہزادہ) میں حکومت کے معاملات میں مذہب اور اخلاق کو برطرف کر کے خالص ابن الوقتی حکمت عملی کی تلقین کی۔ اس باطل پرست اطالوی مفکر کے نزدیک مملکت ہی 'معبود' یعنی نصب العین ہے، جس کی ضروریات کسی قانونِ اخلاق کے تابع نہیں:

باطل از تعلیم او بالیدہ است حیلہ اندازی فنے گردیدہ است
طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت ایں خشک در جادہ ایام ریخت
شب بچشم اہل عالم چیدہ است مصلحت تزویر را نامیدہ است

(اس کی تعلیم سے باطل نے فروغ پایا اور حیلہ اندازی نے فن کی صورت اختیار کر لی۔ اس نے ایسے مسلک کی بنیاد رکھی جس کا انجام بہت بُرا تھا اور اس طرح زمانے کی راہ میں کانٹے بکھیر دیے۔ اس نے دنیا والوں کی آنکھوں کے سامنے رات کی تاریکی پھیلا دی اور مکر و فن کا نام مصلحت رکھ دیا)۔

اس 'حیلہ اندوز' اور 'نہ از تزویر سیاست کو اقبال 'لادین سیاست' یعنی سیکولرزم کا نام دیتا ہے:

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مُردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکی آزاد فرگیوں کی سیاست ہے دیوبے زنجیر

دین و اخلاق سے بے نیازی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو اپنی انفرادی زندگی میں اخلاق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور مذہب کے احکام کی پیروی کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے، لیکن جب وہی افراد ریاست و حکومت کے معاملات اور بین الاقوامی مسائل پر غور و خوض شروع کرتے ہیں تو ہر قسم کے اخلاقی تقاضوں سے بے نیاز ہو کر فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی سیاست فساد فی الارض کا ایک بدترین سرچشمہ ہے۔ اقتدار کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں ہو یا عوام کے ہاتھوں میں، جب بھی سیاست کو اخلاق سے علیحدہ رکھا جائے گا تو اس سے فتنہ و فساد ہی پیدا ہوگا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس چنگیزی کے باعث انسان کی تمدنی زندگی تباہی سے دوچار ہے۔ ہر قسم کی ترقی کے باوجود انسان اپنی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہیں۔ معاشی زندگی میں استحصال و لوٹ، سماجی زندگی میں بے چینی اور خود غرضی، بین الاقوامی سطح پر باہمی بد اعتمادی، جنگ کی خوف ناک

تیریاں، یہ سب پریشان کن حالات اقبال کے خیال میں صرف سیکولر نقطہ نگاہ اختیار کرنے کا نتیجہ ہیں:

یورپ از شمشیرِ خود بسملِ فتاد زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برہ ہر زماں اندر کمینِ برہ
مشکلاتِ حضرتِ انساں از دست آدمیت را غمِ پنہاں از دست

(یورپ اپنی تلوار سے خود ہی گھائل ہو چکا ہے۔ اس نے دنیا میں رسمِ لادینی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس کی حالت اس بھیڑیے کی سی ہے جس نے بکری کے بچے کی کھال اڈھ رکھی ہے۔ وہ ہر لمحے ایک نئے برہ کی گھات میں ہے۔ نوعِ انسان کی ساری مشکلات اس کی وجہ سے ہیں۔ اسی کی وجہ سے انسانیت غمِ پنہاں میں مبتلا ہے۔)

یہاں تک کہ وہ علم و تحقیق جو اقبال کے نزدیک انسانی خودی کے استحکام کے لیے ضروری ہے، اس لادین نقطہ نگاہ کے زیر اثر قومی خودی کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ تفسیر کائنات کا مقصد انسان کو اس دنیا میں صحیح معنوں میں نائبِ حق کے منصب کا اہل بنانا تھا لیکن بد قسمتی سے اس سیکولر ترجمان نے اس میں وہ زہر ملا دیا ہے جس کے باعث خود مار ہادر پیچ و تاب:

علمِ اشیا خاکِ ما را کیمیا ست آہ! درِ افرنگِ تاثیرش جدا ست
آہ! از افرنگِ و از آئینِ او آہ از اندیشہٗ لادینِ او
اے کہ جاں را بازی دانی ز رتن سحرِ ایں تہذیبِ لادینے شکن

(علمِ اشیا کائنات نے ہماری خاک کو کیمیا بنا دیا ہے مگر افسوس کہ اہلِ فرنگ پر اس کی تاثیر مختلف انداز میں ظاہر ہوئی۔ افسوس ہے افرنگ پر اور اس کے طریق کار پر، اس کی لادین فکر پر بھی افسوس ہے۔ اے مسلمان! تو جو روح کو بدن سے الگ سمجھتا ہے اٹھ اور اس لادین تہذیب کے جادو کو توڑ دے۔)

یہی علم خیر کثیر ہے۔ اگر اس کا تعلق حق تعالیٰ سے ہو۔ اگر دین و اخلاق کے سرچشمے سے رابطہ موجود ہو تو یہ علم پیغمبری کے ہم پایہ ہے۔ لیکن جب یہ علم سوزِ دل سے عاری ہو جائے اور حق سے بیگانگی کا مظہر ہو، تو یہ بجائے خیر کثیر کے شرِ اعظم بن جاتا ہے، جس کے فساد کی لپیٹ میں اس وقت ساری دنیا پھنسی ہوئی ہے۔ اس کا واحد علاج اقبال کی نگاہ میں لادینیت کو ہمیشہ کے لیے ختم

کرنا ہے۔ انسانی زندگی میں سکون و اطمینان، راحت و سعادت تبھی ممکن ہے کہ دین و دنیا کی دوئی ہمیشہ کے لیے ختم کر دی جائے۔ اخلاق اور سیاست کی بے تعلقی کے باعث جو غیر متوازن حالات پیدا ہوئے ہیں، اس کو اقبال نے بڑے عمدہ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی ساتی کہاں اس فقیری میں میری
 خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سر بلندی ہے، یہ سر بنزیری
 سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
 ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
 دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
 یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا بشری ہے آئینہ دارِ ندیری
 اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جئیدی و اردشیری

جب علم و قوت، لادینی سے متاثر ہوں تو زہر ہلاہل سے زیادہ خوف ناک ہیں لیکن جب یہی علم و قوت، دین و اخلاق سے مربوط ہوں تو زہر کا تریاق اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ ایوبی اور نگاہ بازید ایک ذات میں موجود ہونا ہی انسانیت کی بقا کا ضامن ہے۔ جب انسان اس نہ سہم کے طلسم کو توڑ دیتا ہے لیکن اس کے نشیب و فراز، رنج و راحت سے متاثر نہیں ہوتا تبھی دنیا فساد و فتنہ سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

شکوہ خسروی این است این است

ہمیں ملک است کو توام بہ دین است

(بس یہی شکوہ خسروی ہے، یہی سلطنت ہے جو دین کے ساتھ جڑواں ہے)۔

لادینیت کا ایک دوسرا مظہر وطن کا غلط تصور ہے۔ بد قسمتی کہنا چاہیے کہ اس خطرناک نظریے کا آغاز بھی تحریک اصلاح کلیسا کے ہاتھوں ہوا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ کلیسائی حاکمیت کے باعث تمام عیسائی ممالک ایک رشتہ اخوت میں منسلک تھے اور اس اتحاد و اخوت کی بنیاد مذہبی اور اخلاقی یگانگت پر تھی۔ جب لو تھر نے کلیسا کے اس عالم گیر نظام کو ختم کر دیا تو ہر ملک کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے کسی نفسیاتی بنیاد کی ضرورت تھی۔ یہ نفسیاتی بنیاد نظریہ وطن و نسل نے

فراہم کی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ لو تھر کی یہ بغاوت درحقیقت جرمن قومیت کی سرفرازی کے لیے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیح کے عالم گیر نظام اخلاق کے بجائے بے شمار اخلاقی نظام وجود میں آئے۔ چنانچہ اہل مغرب کی نگاہیں اس عالم گیر انسانی نصب العین سے ہٹ کر اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ کر رہ گئیں۔ اس کے لیے انھیں وطنیت کے تصور سے زیادہ اور کوئی بہتر اساس میسر نہ آئی۔

وطنیت کی یہ اساس اپنے بنیادی مفہوم میں انسانی جماعت کی ہیئت کا ایک سیاسی اصول ہے، جس کے مطابق ایک خاص جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگ جو ایک ہی زبان اور نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اس وطن کو اپنا معبود اور نصب العین قرار دیتے ہیں۔ وطن ہی ان کی تمام وفاداریوں کا مرکز ہے اور وہی نیکی اور بدی، خیر و شر کا آخری معیار۔ اس لیے اقبال نے مختلف جگہ 'وطن' کو دیوتا اور خدا کے نام سے پکارا ہے۔ ع ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ وطنیت کا یہ سیاسی نظریہ انسانیت کے لیے ستم قاتل ہے کیونکہ اس کے باعث انسان آدمیت سے محروم ہو کر اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند	بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند	نوع انسان را قبائل ساختند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است	تلخی پیکار بار آوردہ است
مردی اندر جہاں افسانہ شد	آدمی از آدمی بیگانہ شد

(اہل مغرب نے اس طرح اخوت کی جڑ کاٹی ہے کہ وطن کی بنا پر قوم کی تعمیر کی ہے۔ وطن کو شمع محفل بنانے سے نوع انسان مختلف قبائل میں تقسیم ہو گئی ہے۔ انھوں نے جہنم میں جنت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر تک پہنچا دیا ہے۔ وطنیت کے شجر نے دُنیا سے جنت (امن و سکون) رخصت کر دیا ہے۔ اس درخت کا پھل جنگ کی تلخی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ دونوں عالمی جنگیں وطنیت کی بنا پر لڑی گئیں۔ انسانیت دُنیا میں افسانہ بن کر رہ گئی۔ آدمی آدمی سے بیگانہ ہو گیا)۔

اسلام کا مقصد محض انسانوں کی اخلاقی اصلاح نہیں بلکہ ان کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب پیدا کرنا ہے جو قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو بدل کر خالص انسانی شعور پیدا

کرے۔ ”اسلام نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی اور نہ پرائیویٹ، بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد تمام فطری امتیازات کے باوجود عالم بشریت کو متحد اور منظم کرنا ہے۔ ایسا نظام صرف عقائد کی بنا پر ہی قائم ہو سکتا ہے۔ صرف یہی وہ طریقہ ہے جس سے عالم انساں کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے“۔ (حرف اقبال، ص ۲۵۱-۲۵۲)

یہ اساسی عقیدہ اقبال کے خیال میں صرف توحید ہے جس کی بنا پر انسانی سوسائٹی کو ایک بہتر طریقے سے منظم کیا جاسکتا ہے۔ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری وفاداریاں ملوک و سلاطین اور دیگر سارے مفادات سے ہٹ کر صرف ذات الہی سے مخصوص ہو جائیں۔ چونکہ یہ ذات الہیہ فی الحقیقت زندگی کی روحانی اساس ہے، اس لیے اللہ کی اطاعت دوسرے لفظوں میں انسان کی اپنی فطرت صحیحہ کی اطاعت ہوئی۔ جب اس اصل توحید کو سیاسی اصول عمل کی حیثیت دی جاتی ہے تو اس سے انسان کو بحیثیت انسان دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت ملک، قوم، رنگ نسل وغیرہ کے امتیاز بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک قابل امتیاز اگر کوئی شے ہے تو وہ انسانی اعمال کا اچھا اور بُرا ہونا ہے نہ کہ اس کا رنگ نسل وغیرہ۔ ”وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو نسل و زبان و رنگ سے بالا ہو۔ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا“ (ایضاً، ص ۲۴۷)۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است

اصل تہذیب احترامِ آدم است

(آدم کا مقام آسمان سے بھی بلند تر ہے، احترامِ آدم ہی تہذیب کی بنیاد ہے)۔

اقبال نے جب بین الاقوامی سطح پر جمعیت اقوام کی مخالفت کی تو اس کا باعث بھی اس نظریہ وطنیت کی مخالفت تھی۔ اس کے خیال میں کوئی ایسا بین الاقوامی ادارہ جس کی بنیاد انسانوں کے اجتماع کے بجائے محض اقوام کا اجتماع ہو، کبھی خیر و سعادت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس کے نزدیک صحیح نصب العین جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم ہونا چاہیے۔

تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود

اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

اقبال نے اپنے کلام میں لادینی جمہوریت کی سخت مخالفت کی ہے جس کی بنا پر لوگوں نے اس پر فسطائیت کا الزام لگایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی مخالفت کا باعث جمہور دشمنی نہیں بلکہ جمہوریت دشمنی ہے۔ وہ عام لوگوں کی صلاحیت کا نہ منکر ہے اور نہ ان کو آزادی راے اور صحیح اختیارات دینے کے خلاف ہے۔ اس کے خیال میں ہر بنی آدم تکریم و عظمت کا حامل ہے۔ نیٹھے کے خیال میں عوام صحیح معنوں میں 'انام' ہیں اور اس لیے اس نے تمام اختیارات و حقوق ان سے لے کر فوق البشر کے سپرد کر دیے۔ ان کے لیے سوائے تقلید اور پیروی کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ لیکن اقبال کے ذہن میں عوام سے متعلق کوئی ایسا پست تخیل موجود نہیں۔ "اسلامی جمہوریت ایک روحانی اصول ہے جس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ ہر انسان چند بالقوہ صفات کا حامل ہے جو ایک خاص قسم کی سیرت کی تشکیل سے بروے کار آ سکتی ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جن لوگوں نے بہترین کارنامے پیش کیے وہ بھی عوام ہی تھے"۔ (دیباچہ اسرارِ خودی، انگریزی ترجمہ، ص ۱۹، لاہور ۱۹۵۰ء)

اقبال نے جب جمہوریت پر اعتراض کیا ہے تو اس سے اس کی مراد جمہوریت کی وہ شکل ہے، جو مغرب میں موجود ہے جس کی اساس وطن و قوم کے غلط تصور پر قائم ہے اور جس نے لوگوں کو اخلاق اور انسانیت کا پیغام دینے کے بجائے فتنہ و فساد، خون ریزی اور ہلاکت، استحصال اور لوٹ مار کے بازار گرم کیے ہیں۔ یہ سرمایہ داروں کی جنگ زرگری ہے۔ قیصریت اور استبداد کا ایک پردہ ہے۔ اس 'شرابِ رنگ و بو' کو اختیار کرنے سے سوائے نامرادی کے اور کچھ حاصل نہیں:

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است رن از گردنِ دیوے کشاد است
ز باغش کشتِ ویرانے نکوتر ز شہر او بیابانے نکوتر
گروہے را گروہے در کمین است خدائش یار اگر کارش چنیں است

(فرنگ نے جمہوری آئین کی بنیاد رکھ کر دیو کی گردن کو زنجیر سے آزاد کر دیا ہے۔ اس کے باغ سے ویران کھیتی اور اس کے شہروں سے بیابان بہتر ہیں۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کی گھات میں ہے، اگر معاملہ یہی رہا، تو پھر ان سے بھلائی کی کوئی امید نہ رکھ)۔

جمہوریت کی حقیقی غلطی اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ لادینی نقطہ نگاہ کے زیر اثر مغرب نے لوگوں کو ہر معاملے میں مطلق العنان بنا دیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی مقصد و مطلب ہے تو صرف مادی منفعت نہ کہ انسانی بھلائی۔ صحیح روحانی جمہوریت وہ ہے جس میں اقتدار کا ماخذ عوام کے بجائے ذاتِ باری ہو۔

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے

حکراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

جاوید نامہ میں اس سلسلے میں کہتے ہیں:

غیر حق چوں ناہی و آمر شود زور ور بر ناتواں قاہر شود

زیر گردوں آمری از قاہری است آمری از ماسوا اللہ کافری است

(جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس سے طاقت ور کمزور پر مسلط ہو جاتا ہے۔ روئے زمین پر حکومت جبر سے قائم ہوتی ہے۔ اس لیے ماسوا اللہ کی حکومت کافر ہی ہے۔)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانوں کو اجتماعی طور پر کسی نظام کی ضرورت نہیں بلکہ صرف وہی نظام مملکت عدل و انصاف قائم کر سکتا ہے جس کی بنیاد اخلاقی اور روحانی اصولوں پر ہو۔ الحکم للہ اور الملک للہ۔ جب تک انسانی تمدن کی بنیاد عالم گیر روحانی اصولوں پر نہ رکھی جائے تب تک امن و عافیت ممکن نہیں۔ مغرب کی لادینی مادیت نے مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔ کبھی وہ جمہوری قبا میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی وہ اشتراکیت کی شکل میں جلوہ فگن ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب قدیم جاہلیت ہی کی تازہ شکلیں ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسی روحانی ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جس نے پہلے بھی اس جاہلیت کے طلسم کو توڑا تھا۔

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم

گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

(اقبال ریویو، لاہور، جولائی ۱۹۶۲ء تا جنوری ۱۹۶۳ء)۔ (انتخاب: اقبالیات کے سو سال،

مرتبین: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر، ڈاکٹر وحید عشرت، ص ۴۷۱-۴۷۸)